سبق : 4

تعلیم القرآن

آن لائن اکیڈمی

(سورۃ ھود ،آیت 36 تا 49)

وَ اُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ اَنَّہٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِکَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ

اور نوح (علیہ السلام) کی طرف وحی کی گئی کہ تمھاری قوم سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے بعد کوئی اور ایمان نہیں لائے گا،

وَ اَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُجۡرِمُوۡنَ: نوح علیہ السلام اپنی قوم کے لوگوں سے کہتے ہیں کہ تم جس طرح حق کا انکار کرتے ہو اور نبی پر طعن اور الزام تراشیاں کرتے ہو یہ بہت بڑا جرم ہے۔ مجھ پر تم جس جرم کا الزام لگاتے ہو میں اس سے بری ہوں اور صاف کہتا ہوں کہ یہ سارا دین اللہ کی طرف سے ہے۔ میں نے تمھیں دین کی دعوت پوری طرح پہنچا دی ہے۔ نوح علیہ السلام کہتے ہیں اگر میں بھی ایسے ہی مطالبات کرتا جیسے تم کر رہے ہو تو پھر میں بھی ایک مجرم ہی ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بچایا ہے۔ میں نے اللہ رب العالمین کی طرف سے ایک داعی کی حیثیت سے اپنا کام مکمل کر دیا ہے۔ اب اس کے بعد جس نے انکار کیا اسے سزا ملے گی اور وہ مجرم قرار پائے گا۔ ابن کثیر اور دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ درمیانی کلام جملہ معترضہ ہے کہ کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام لگا رہے ہیں کہ آپ نے قرآن کو بنایا ہے تو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا کہ تو جواب دے کہ اگر ایسا ہے تو میرا گناہ مجھ پر ہے۔ جب میں جانتا ہوں کہ اللہ کا عذاب کیسا ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ میں اللہ پر جھوٹ گھڑ لوں، لہٰذا تم اپنے گناہوں کے ذمہ دار خود ہی ہو۔ غور کیا جائے تو بظاہر یہی تفسیر راجح نظر آتی ہے، کیوں کہ اس واقعہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں دوبارہ کافروں کے افترا کا رد کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے، فرمایا: ﴿ تِلۡکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡہَاۤ اِلَیۡکَ ۚ مَا کُنۡتَ تَعۡلَمُہَاۤ اَنۡتَ وَ لَا قَوۡمُکَ مِنۡ قَبۡلِ ہٰذَا ۛؕ فَاصۡبِرۡ ۛؕ اِنَّ الۡعَاقِبَۃَ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴾ [ھود: ۴۹] ”یہ غیب کی خبریں ہیں جن کو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ کو ان کا علم تھا اور نہ آپ کی قوم کو، لہٰذا صبر کیجیے! بے شک اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے۔“

آیت 36 ﴾ وَ اُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ اَنَّہٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِکَ . . . : اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام پر وحی کر کے واضح کر دیا کہ جتنے لوگوں نے ایمان لانا تھا وہ لا چکے ہیں، اب اس کے بعد کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ یہ بات اللہ رب العالمین نے اپنے

بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

لٰہذا ان کے کاموں پر غم نہ کرو ﴿36﴾

علم کی بنیاد پر کہی، کیوں کہ علمِ غیب صرف اسی کے پاس ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس نے ایمان لانا ہے اور کس نے نہیں لانا۔ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال محنت کی اور اپنی قوم کو دعوت دیتے رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ اب تمھاری قوم میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لائے گا۔ جس پر نوح علیہ السلام نے بددعا کی اور آسمانوں سے عذاب نازل ہوا۔ نوح علیہ السلام کی بددعا پر عذاب کا ذکر سورۂ نوح (۲۶)، سورۂ قمر (۱۰) اور بعض دوسری سورتوں میں بھی ہے۔ یہاں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب تک لوگوں کے سننے اور ماننے کی امید ہے اس وقت تک دعوت کا کام ہو گا۔ داعی حضرات کو کبھی بھی اپنی کوشش ترک نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی بددعا کرنی چاہیے۔ آپ دیکھیں کہ ساڑھے نو سو سال بعد بھی نوح علیہ السلام نے اس وقت بددعا کی ہے جب اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ اب مزید کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا۔ ہمارے ہاں لوگ بہت جلد پریشان ہو جاتے ہیں اور منہ سے ایسے الفاظ کہہ دیتے ہیں، یا ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ جنھیں ہم دعوت پیش کر رہے ہیں انھوں نے تو ماننا ہی نہیں ہے۔ یہ سوچ کر وہ مایوسیاں پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ انداز درست نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ سارے واقعات بیان کر کے انبیاء علیہم السلام کا اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے اور علماء اور داعی حضرات کے لیے ایک طریق کار واضح کر دیا ہے کہ جب تک دعوت کے راستے کھلے ہیں اور بات سنی جا رہی ہے تم نے دعوت پیش کرتے ہی رہنا ہے اور اس سے پیچھے نہیں ہٹنا۔ دعوت کے لیے حکمت ضرور اختیار کرنی چاہیے، لیکن اپنے کام کو ہر صورت جاری رکھنا ہے۔ سورۂ ہود قرآن مجید کی ان چند ایک سورتوں میں سے ہے جن کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ان سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سورتوں میں قوموں پر آنے والے بڑے بڑے عذابوں کا ذکر ہے کہ کس طرح قوموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ ان سورتوں کے مطالعہ سے اللہ تعالیٰ کا پورا نظام سمجھ آ سکتا ہے کہ اس ذات باری تعالیٰ کا غصہ کب بھڑکتا ہے اور عذاب کیوں کر نازل ہوتے ہیں۔

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ: ''لٰہذا ان کے کاموں پر غم نہ کرو۔'' نوح علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے کہ آپ کی قوم نے دلائل سننے اور حقائق دیکھنے کے بعد بھی انکار، مخالفت اور بغاوت کا جو رویہ اختیار کیا ہے اس پر آپ نے غم نہیں کرنا اور مایوس و پریشان نہیں ہونا۔ نوح علیہ السلام کے دل پر یقیناً اس چیز کا بہت گہرا اثر تھا کہ میں نے ساڑھے نو سو سال تک اتنی محنت و مشقت کی ہے لیکن یہ لوگ ایمان نہیں لائے اور اب یہ سارے لوگ رب تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو کر جہنم میں چلے جائیں گے۔ ہر نبی کے دل میں خیر خواہی کا یہ شاندار جذبہ ہوتا ہے کہ لوگ دعوت قبول کر کے عذاب سے بچ

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے کشتی بنائیے اور مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں مخاطب نہ ہونا جنھوں نے ظلم کیا، یقیناً وہ سب غرق کیے جانے والے ہیں ﴿37﴾

جائیں۔ یہ جذبہ اور احساس ہی دعوت کی بنیاد بنتا ہے اور یہ چیز ایک داعی کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ نوح علیہ السلام سینکڑوں سال دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہے لیکن ان کے دل میں پھر بھی غم اور پریشانی ہے کہ لوگ مانتے کیوں نہیں ہیں۔ یہ امتِ محمد ﷺ کے داعیان کے لیے بہت بڑی دعوت ہے کہ ان کے دلوں میں بھی اخلاص اور خیرخواہی کا یہ جذبہ بہت زیادہ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ہی کوئی شخص سچا داعی بن کر اپنی دعوت کو بھرپور انداز میں جاری رکھ سکتا ہے۔ اگر داعی میں یہ چیز نہیں ہے تو پھر وہ دعوت کا حق بھی صحیح طریقے سے ادا نہیں کرسکتا۔

آیت 37 ﴿ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا: نوح علیہ السلام سے کہا جارہا ہے کہ دعوت کے مراحل مکمل ہو چکے، اب اللہ کے عذاب کا وقت آچکا ہے اس لیے آپ ایک کشتی تیار کریں۔ اس کے بعد پھر جیسے جیسے آسمانوں سے ہدایت آتی گئی کہ کشتی اتنی بڑی ہونی چاہیے اور اس میں اتنی گنجائش ہونی چاہیے، اس کے مطابق نوح علیہ السلام کشتی تیار کرتے گئے۔ اللہ رب العالمین نے چونکہ نسلِ انسانی کو بچانا تھا اس لیے کشتی بنانے کا حکم دیا گیا۔ آیت میں "بِاَعْيُنِنَا" کے لفظ ہیں، بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ ہماری نگرانی میں کشتی بنائیے لیکن قرآن مجید کے الفاظ بہت صاف اور واضح ہیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی تیار کیجیے۔ اصل میں بہت سارے لوگ رب تعالیٰ کی صفات ہاتھ اور آنکھ وغیرہ کی تاویل کرتے ہیں، لیکن اس کی صفات کو اسی طرح تسلیم کرنا چاہیے جس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں "عَيْنٌ" کا لفظ آیا ہے تو اس کا ترجمہ "آنکھ" ہی کریں گے، ایسے ہی "يَدٌ" کا ترجمہ "ہاتھ" ہی کیا جائے گا۔ ہم تاویل کرکے ان الفاظ کا ترجمہ تبدیل نہیں کریں گے۔ تاویل کرنا اشاعرہ اور ماتریدیہ وغیرہ کا انداز تھا۔ اس سے بچنا بہت ضروری ہے۔

بعض لوگ یہ بات کہتے ہیں کہ ایسا نہیں کہنا چاہیے کہ اللہ کی آنکھ اور ہاتھ ہیں۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ آنکھ تو انسان اور جانور کی بھی ہوتی ہے، لہٰذا اللہ کی مثل چونکہ کوئی نہیں ہے اس لیے ایسا کہنے سے مشابہت ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ رب تعالیٰ کی صفات والے الفاظ کا ترجمہ بدل دیتے ہیں، حالاں کہ اسی آیت میں یہ ترجمہ بھی کیا جاتا ہے کہ اللہ کہتا ہے میری نگرانی میں کشتی بنائیے تو اگر اللہ تعالیٰ نگرانی کرتا ہے تو نگرانی تو عام لوگ بھی کرتے ہیں۔ مزدور کام کررہے ہوں تو نگرانی ان کی بھی کی جاتی ہے کہ وہ کام ٹھیک کررہے ہیں یا نہیں، مشابہت تو پھر اس سے بھی ہوجاتی ہے۔ اس لیے ترجمہ بالکل واضح کرنا چاہیے، سلف کا موقف بھی یہی ہے کہ اللہ کے اسماء وصفات کے بارے میں تاویل

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۗ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ؕ ﴿۳۸﴾

اور وہ (نوح علیہ السلام) کشتی بناتے رہے اور جب بھی ان کی قوم کے سرداران کے پاس سے گزرتے تو ان سے مذاق کرتے۔ (نوح علیہ السلام نے) کہا اگر تم ہم سے مذاق کرتے ہو تو یقیناً ہم تم سے مذاق کریں گے، جیسا تم مذاق کرتے ہو ﴿38﴾

یا انکار درست نہیں اور نہ ہی اس کی مشابہت اور مثال بیان کی جا سکتی ہے۔

وَ وَحْيِنَا: اور ہمارے حکم سے کشتی بنایئے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات خوب معلوم تھی کہ کشتی کتنی بڑی ہونی چاہیے، اس میں کتنے لوگوں اور جانوروں نے سوار ہونا ہے، اس میں کتنا وزن اٹھانے کی صلاحیت ہو اور پھر اس میں کیا کیا سہولیات ہونی چاہییں؟ کیوں کہ یہ اصول کی بات ہے کہ کشتی میں گنجائش سے زیادہ وزن ہو تو وہ ڈوب جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے بندے نوح (علیہ السلام) کو کشتی تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم وحی کے ذریعے آیا اور اللہ رب العالمین بتاتا گیا کہ کشتی کا ڈیزائن کیسا ہوگا، اس میں گنجائش کتنی ہوگی اور کیا کیا سہولیات رکھی جائیں گی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے حکم نازل کر کے اپنی آنکھوں کے سامنے کشتی تیار کروائی۔

وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا....: اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو یہ حکم بھی دے دیا کہ ظلم کرنے والوں کے بارے میں آپ نے مجھ سے سفارش نہیں کرنی۔ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔یعنی جنھوں نے شرک کا ارتکاب کیا، اس پر مصر رہے اور توبہ کر کے واپس نہیں پلٹے، ان کے بارے میں بات نہیں کرنی۔فرمایا: ﴿اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ﴾ جو بھی شرک میں مبتلا رہے سب کے سب غرق کر دیے جائیں گے اور ان میں سے کوئی نہیں بچے گا۔

آیت 38 ﴿ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ....: قوم نوح کے سردار جب آ کر دیکھتے کہ نوح علیہ السلام ایک بڑی کشتی بنا رہے ہیں تو وہ کہتے کہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہاں پر تو خشکی ہے اور کہیں پانی نظر نہیں آ رہا، یہاں کون سا دریا ہے جسے عبور کرنے کے لیے تم کشتی بنا رہے ہو۔ وہ چونکہ ایمان نہیں لائے تھے اس لیے انھیں معلوم نہیں تھا کہ نوح علیہ السلام اللہ کے سچے نبی ہیں اور عنقریب ان پر دردناک عذاب آنے والا ہے۔جن لوگوں نے مان لیا ان کے لیے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اس بارے میں سوچیں کہ نبی نے یہ حکم کیوں دیا ہے۔ جب نبی پر ایمان لے آئے تو اس کے بعد پھر ان کی اطاعت ہی کرنی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ نبی کی سب باتیں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں اور اس میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔مومن کا ذہن بہت صاف ستھرا ہوتا ہے۔ وہ نہ انکار کرتا ہے اور نہ ہی تاویل کی گنجائشیں رکھتا ہے لیکن جب ایمان اور یقین نہ ہو کہ یہ سچے نبی ہیں، ان پر وحی آتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے کلام کرتے ہیں تو پھر بندہ اِدھر اُدھر کی الٹی سیدھی باتیں ہی کرتا ہے۔ مذاق اڑانا بھی غلط باتوں میں سے ایک ہے۔ یہ بھی انکار ہی کا ایک بدترین انداز ہوتا

فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ يَّاۡتِيۡهِ عَذَابٌ يُّخۡزِيۡهِ وَ يَحِلُّ عَلَيۡهِ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ ﴿۳۹﴾

پھر تمھیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر دائمی عذاب نازل ہوتا ہے ﴿39﴾

ہے اور جس کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جائے اسے اس مکروہ قسم کے انکار کی سخت تکلیف ہوتی ہے۔

آپ ہمیشہ قرآن مجید میں پڑھیں گے کہ قوموں نے نبیوں کی باتوں کا بہت مذاق اڑایا۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی عظمت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مقام و مرتبہ کی حفاظت خود کرتا ہے۔ نبی کے ساتھ مذاق کرنے اور ان کی گستاخی کو ہمیشہ بہت بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔ آج بھی نبی کی گستاخی بڑا جرم ہے اور اسلام نے اس کی سخت سزا رکھی ہے۔ اللہ کے دشمنوں اور باغیوں کا رویہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ وہ نبیوں اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ مذاق کر کے انھیں تکلیف پہنچاتے ہیں۔ بغاوتوں پر آمادہ ایسے لوگ بدترین منکر ہوتے ہیں۔ نوح علیہ السلام کی قوم کے لوگوں کا رویہ بھی ایسا ہی تھا اور وہ مذاق کرتے ہوئے کہتے تھے کہ جس طرح خشکی میں تم کشتی بنا رہے ہو یہ کوئی عقل مندی نہیں ہے۔ ان باتوں کے جواب میں نوح علیہ السلام کہتے ہیں کہ آج تو تم مذاق کر رہے ہو لیکن جب تم پر عذاب آئے گا تو پھر ہم تمھیں بتائیں گے کہ اس کشتی کے تیار کرنے میں کیا حقیقت تھی۔ ایک تو یہ بات ہے اور دوسرا یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا جواب ہے کہ جب قوم کے سردار نوح علیہ السلام کا مذاق اڑا رہے تھے تو اس پر رب تعالیٰ نے کہا کہ آج تو تم مذاق کرتے ہو لیکن کل ہم تمھارے ساتھ مذاق کریں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے والے مشرکینِ مکہ کے متعلق بھی قرآن میں یہی بیان ہوا ہے: ﴿ اَللّٰهُ يَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ ﴾ [البقرۃ: ۱۵] اللہ تعالیٰ بھی ان کے ساتھ مذاق کرے گا۔ اس لیے یہ دونوں جواب ہو سکتے ہیں۔

آیت 39 ﴿ **فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ يَّاۡتِيۡهِ عَذَابٌ يُّخۡزِيۡهِ . . .** : وہ وقت دور نہیں ہے جب آسمانوں سے آنے والا عذاب تمھارے سامنے ہو گا اور یہ عذاب تمھیں رسوا کر دے گا۔ یہ بات دنیا کے عذاب کے لیے ہے اور "يَحِلُّ عَلَيۡهِ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ" سے مراد آخرت کا ہمیشگی والا عذاب ہے۔ دنیا کے عذاب میں رسوائی ہے لیکن یہ ہمیشہ نہیں رہتا، کچھ دیر بعد حالت بدل جاتی ہے۔ عذاب آتا ہے اور پھر زندگی معمول پر آجاتی ہے، اس لیے "عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ" سے مراد آخرت کا عذاب ہی ہے۔ نوح علیہ السلام دنیا اور آخرت دونوں عذابوں کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ یہ عذاب بڑا رسوا کن ہو گا۔ آج تو تم بڑے سردار بنے پھرتے ہو اور طاقت و قوت کے نشے میں مبتلا ہو لیکن جلد تمھارا یہ تکبر اور غرور خاک میں مل جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن کے پاس دولت اور طاقت ہوتی ہے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو عقل مند اور بڑا سمجھتے ہیں جبکہ ایمان والوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ انھیں تو کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ یہ ان کا زعم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ بات سمجھائی ہے کہ ہم ان سرداروں کی بڑائی اور تکبر ختم کر کے انھیں رسوائی سے دوچار کر دیں گے۔ جب رب تعالیٰ کا عذاب آتا ہے تو یہ ساری چیزیں ختم ہو جاتی ہیں اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡہَا مِنۡ کُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ

حتیٰ کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور تنور نے جوش مارا تو ہم نے کہا کہ اس (کشتی) میں ہر چیز کا جوڑا جوڑا (نر اور مادہ) سوار

اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ”عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ“ کی بات کی ہے، مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اس عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ جس پر عذاب آ گیا وہ اس میں سے نکل نہیں سکے گا۔ دنیا کے عذاب سے تو موت آ جانے کے بعد نجات مل جائے گی لیکن آخرت کے عذاب سے موت بھی نہیں بچا سکتی، کیونکہ قیامت کے بعد تو موت بھی نہیں آنی۔ آپ دیکھیں کہ نوح علیہ السلام کا انداز یہاں دعوت والا ہے، آپ اپنی قوم سے کہہ رہے ہیں کہ اب بھی ڈر جاؤ اور سنبھل جاؤ۔ داعی کا مزاج ایسا ہی ہونا چاہیے کہ اس کی زبان سے بات نکلے تو اس میں دعوت ہو۔ قوم کے لوگ مذاق کر رہے ہیں لیکن نوح علیہ السلام کا رویہ پھر بھی یہ ہے کہ وہ ان کی خیرخواہی چاہتے ہیں۔ یہ بہترین اسلوبِ دعوت ہے جو نوح علیہ السلام کی طرف سے اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی وہ اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ میرے لیے تمھارا مذاق کوئی اہمیت نہیں رکھتا، مجھے فکر صرف اس بات کی ہے کہ تم اللہ کی پکڑ سے بچ جاؤ اور اس کے ہمیشگی والے عذاب کا شکار نہ ہو جاؤ۔

آیت 40 ﴿حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوۡرُ . . .﴾: اللہ تعالیٰ نے جب عذاب کا سلسلہ شروع کیا تو ہر چیز سے پانی ابلنے لگا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ ”التَّنُّوۡرُ“ سے مراد یہاں مطلق زمین ہے کہ زمین کے نیچے جو پانی تھا وہ ابل کر اوپر آنے لگا۔ [تفسیر الطبري : ۴۰۱/۱۲] اور قرآن مجید میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے، فرمایا: ﴿وَّ فَجَّرۡنَا الۡاَرۡضَ عُیُوۡنًا﴾ [القمر : ۱۲] کہ ہم نے زمین کو چشموں سے پھاڑ دیا۔ یا پھر تنور سے مراد وہی ہے جس میں روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ یہی معنی معروف اور راجح معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے نشانی رکھی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ رب العالمین نے نوح علیہ السلام کو نشانی بتائی تھی کہ جب تنور سے پانی نکلنا اور جوش مارنا شروع ہو جائے تو سمجھ جاؤ کہ اللہ کا عذاب آ گیا ہے۔ اس کے بعد پھر تاخیر نہ کرنا اور فوراً ان سب کو کشتی میں سوار کر لینا تاکہ وہ طوفان سے محفوظ ہو جائیں۔ قرآن مجید میں دوسرے مقام پر ہے کہ جب زمین سے پانی ابلنے لگا تو اس کے ساتھ ہی آسمان سے بھی پانی برسنے لگا۔ [دیکھیے القمر : ۱۱] اللہ تعالیٰ نے سطح زمین پر اتنا پانی نازل کیا اور اتنا بڑا اسیلاب اور طوفان آیا کہ وہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی اوپر نکل گیا۔

جب عذاب کی یہ خوفناک کیفیت بنی تو اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ ہم نے نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ ہر جاندار میں سے ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کر لو، کیوں کہ یہ عذاب ایسا ہے کہ پانی درختوں اور پہاڑوں سے بھی اوپر جائے گا اور کوئی جاندار چیز حتیٰ کہ درختوں پر پناہ لینے والے پرندے بھی نہیں بچیں گے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے جانوروں اور پرندوں کی نسلیں بھی باقی رکھیں۔ دنیا کا یہ سلسلہ طویل عرصہ آباد رہنا ہے، اس زمین کی آبادکاری کے لیے جانوروں،

وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾

کرلو اور اپنے گھر والوں کو بھی، بجز ان کے جن پر فیصلہ ہو چکا اور اس کو بھی (سوار کرلو) جو ایمان لے آیا اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے ﴿40﴾

حشرات الارض اور دوسری سب چیزوں کی ضرورت ہے، اس لیے نوح علیہ السلام کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ ہر چیز میں سے نر اور مادہ کے ایک ایک جوڑے کو سوار کر لیں تاکہ ان کی نسل باقی رہے۔

وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ: اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ اپنے گھر والوں اور اپنے اہل و عیال کو بھی اس کشتی میں بٹھالو، البتہ اسے ساتھ نہیں بٹھانا جس کے بارے میں طے ہو گیا ہے کہ یہ اللہ کے عذاب کا شکار ہو گا۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اصول یہ بیان کیا: ﴿ وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ [هود: ۳۷] جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور شرک کا ارتکاب کرتے رہے ان پر اللہ کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ فرمایا اے نوح! تیرے بیٹے اور تیری بیوی کے متعلق بھی رب تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ انھیں کشتی میں نہیں بٹھانا اور اپنے ساتھ شامل نہیں کرنا، ان کے علاوہ خاندان کے دوسرے لوگوں اور باقی سب ایمان والوں کو اپنے ساتھ رکھو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو اسلام قبول کر چکے ہیں انھیں اپنے ساتھ کشتی میں سوار کرلو۔

وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ: ''اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے۔'' بعض نے اس حوالے سے چالیس اور بعض نے اسّی کا عدد لکھا ہے کہ ساڑھے نو سو سال کی محنت کے نتیجے میں اتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام کی دعوت اور محنت کو قبول کر رہا ہے اور امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت کی جا رہی ہے کہ اگر کسی جگہ دعوت کمزور رہ جائے تو تم نے یہ نہیں سمجھنا کہ دعوت کامیاب نہیں ہو رہی۔ آپ نے اکثریت کو دیکھ کر اپنی دعوت کو جاری نہیں رکھنا بلکہ جتنے لوگ بھی آپ کو مل جائیں وہی آپ کا اثاثہ، آخرت میں نجات کا ذریعہ اور آپ کے مشن کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔ آپ اپنے ذہن میں دعوت کا مشن پختہ رکھ کر اپنے کام کو ہر صورت میں جاری رکھیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سب سے زیادہ تعداد میں ہو گی، جیسا کہ حدیث میں ہے، سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: ((عُرِضَتْ عَلَيَّ الْأُمَمُ فَجَعَلَ يَمُرُّ النَّبِيُّ مَعَهُ الرَّجُلُ، وَالنَّبِيُّ مَعَهُ الرَّجُلَانِ، وَالنَّبِيُّ مَعَهُ الرَّهْطُ، وَالنَّبِيُّ لَيْسَ مَعَهُ أَحَدٌ، وَرَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْأُفُقَ، فَرَجَوْتُ أَنْ تَكُوْنَ أُمَّتِيْ، فَقِيْلَ: هٰذَا مُوْسٰى وَقَوْمُهُ، ثُمَّ قِيْلَ لِيْ: انْظُرْ، فَرَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْأُفُقَ، فَقِيْلَ لِيْ: انْظُرْ هٰكَذَا وَهٰكَذَا، فَرَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْأُفُقَ، فَقِيْلَ: هٰؤُلَاءِ أُمَّتُكَ)) [صحيح البخاري، كتاب الطب، باب من لم يرق: ۵۷۵۲۔ مسلم: ۲۲۰] ''تمام امتیں میرے سامنے پیش کی گئیں، بعض انبیاء علیہم السلام گزرے جن کے ساتھ صرف ایک ایک آدمی تھا اور بعض ایسے نبی بھی گزرے جن کے

وَ قَالَ ارۡكَبُوۡا فِيۡهَا بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَ مُرۡسٰٮهَا ؕ اِنَّ رَبِّىۡ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۴۱﴾

اور (نوح علیہ السلام نے) کہا اس کشتی میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا ہے۔ بے شک میرا رب یقیناً بہت بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿41﴾

ساتھ دو آدمی تھے، کچھ انبیاء علیہم السلام ایسے بھی تھے جن کے ساتھ ایک چھوٹی سی جماعت تھی اور کچھ ایسے بھی تھے کہ ان کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر میں نے ایک بڑی جماعت دیکھی جس نے افق کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید یہ میری امت ہے۔ مجھے کہا گیا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت کے لوگ ہیں۔ پھر مجھے کہا گیا کہ دیکھو، میں نے دیکھا کہ وہاں بے شمار لوگ ہیں جن سے تمام افق بھرے پڑے ہیں۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ اِدھر اور اُدھر دیکھو، میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے تمام افق کو ڈھانپ رکھا ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہ لوگ آپ کی امت ہیں۔‘‘

آیت 41 ﴿ وَ قَالَ ارۡكَبُوۡا فِيۡهَا بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَ مُرۡسٰٮهَا .... : نوح علیہ السلام نے سب کو دعا سکھائی کہ کشتی میں سوار ہو جاؤ اور اللہ کا نام لے کر سوار ہونا ہے۔ تمھیں اس بات کا پختہ ایمان رکھنا ہے کہ یہ کشتی چلے گی بھی اللہ کے حکم سے اور رکے گی بھی اللہ کے حکم سے، یعنی مجھے اس بات کا علم نہیں ہے کہ کس وقت تک عذاب رہے گا، کتنے دن یہ تیرتی رہے گی اور کس مقام پر پہنچ کر یہ رکے گی۔ یہ سارے کا سارا معاملہ رب تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کو جو منظور ہو گا وہی ہو گا۔ اس کا مطلب ہے کہ سواری پر سوار ہوتے وقت یہ دعا پڑھنی چاہیے اور اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا سکھلائی ہے وہ بھی پڑھ لینی چاہیے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر پر نکلتے ہوئے اپنے اونٹ پر سوار ہوتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہتے، پھر یہ دعا پڑھتے: ((سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْنَ وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ، اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ فِيْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى، اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهُ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ)) [صحیح مسلم، کتاب الحج، باب مایقول إذا رکب .... : ۱۳۴۲] ’’پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے اسے مطیع کر دیا، حالانکہ ہم اسے قابو میں کرنے والے نہ تھے۔ اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف یقیناً لوٹ جانے والے ہیں۔ اے اللہ! ہم تجھ سے اپنے اس سفر میں نیکی اور پرہیز گاری مانگتے ہیں اور ایسے کام کا سوال کرتے ہیں جسے تو پسند کرے۔ اے اللہ! ہم پر اس سفر کو آسان کر دے اور اس کی مسافت کو ہم پر تھوڑا کر دے۔ اے اللہ! تو ہی سفر میں رفیق اور گھر میں نگران ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے سفر کی تکلیفوں اور رنج و غم سے اور اپنے مال اور گھر والوں میں برے حال میں لوٹ کر آنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔‘‘

ان دونوں دعاؤں میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ لازمی طور پر میں نے اپنی منزل پر پہنچ جانا ہے۔ معلوم

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۚ وَنَادٰى نُوْحُ ࣙابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ

يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾

اور وہ ان کو لے کر پہاڑوں جیسی موج میں چل پڑی اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے کو پکارا، جب کہ وہ الگ جگہ پر تھا، اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ شامل نہ ہو ﴿42﴾

نہیں راستے میں کیا بنے گا، یہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کا چلنا اور رک جانا اسی کے حکم سے ہے، البتہ ہمارے لیے حکم یہ ہے کہ معاملے کو رب تعالیٰ کے سپرد کر کے سواری پر سوار ہوں اور اس بات کا پختہ عزم اور ایمان رکھیں کہ اللہ رب العالمین ہماری حفاظت فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو دعائیں سکھائی ہیں ان میں بھی ایمان اور عقیدے کی دعوت ہے۔ اس پر مسلمانوں کو ضرور غور وفکر کرنا چاہیے۔

آیت 42 وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ . . . . : نوح علیہ السلام کی کشتی جب پہاڑوں جیسی موجوں کے درمیان چلنے لگی تو انھوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ نوح علیہ السلام کا بیٹا دور اور الگ تھا۔ وہ ایمان والوں کے ساتھ ملنا پسند نہیں کرتا تھا، لہٰذا جب وہ دنیا میں نہیں ملا تو عذاب کے وقت بھی نہیں مل سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دور کھڑا وسائل استعمال کرنے کا سوچ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایمان ہوتا تو اسے بھی سمجھ آجاتی کہ آج صرف وہی بچے گا جو کشتی میں سوار ہو گا لیکن اس نے چونکہ اسلام کی دعوت قبول نہیں کی تھی اس لیے وہ نہیں آیا۔ نوح علیہ السلام نے اسے دعوت دی کہ کافروں کے ساتھ رہے گا تو مر جائے گا، اس لیے ان کا ساتھ چھوڑ دے اور کشتی میں سوار ہو جا۔ اس کا مطلب یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ نوح علیہ السلام نے جب بیٹے کو کشتی پر آنے کا کہا تو ساتھ یہ دعوت بھی دی کہ اسلام قبول کر لو اور کافروں کے ساتھ نہ رہو، ان کے ساتھ رہتے ہوئے تیرا انجام بھی بہت برا ہو گا۔

وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ . . . . : "مَعْزِلٍ" کا مطلب ہوتا ہے الگ رہ جانا۔ ایک گمراہ فرقے کا نام معتزلہ اسی لیے رکھا گیا کہ وہ سلف کے عقائد سے الگ ہو گئے تھے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ نوح علیہ السلام کے چار بیٹے تھے جن میں سے تین نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ کشتی میں سوار تھے۔ ان تینوں کے نام حام، سام اور یافث بیان ہوئے ہیں جبکہ کنعان نامی بیٹے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن یہ سب اسرائیلی روایات ہیں جن کی تصدیق یا تکذیب نہیں کی جا سکتی۔ مفسرین نے محض معلومات میں اضافے کی خاطر انھیں بیان کر دیا ہے، ان سے علمی فائدہ ہو سکتا ہے لیکن یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جس پر اسلام یا کفر کا فیصلہ ہو یا جس کی پابندی لازم ہو۔ ایک مسلمان کے لیے صرف نبوت اور وحی کے علم پر ایمان لانا ضروری ہے۔ قومِ نوح کے قصے میں بہت زیادہ بحثیں کی گئی ہیں کہ وہ کشتی کیسی تھی، کتنی لمبی تھی اور کتنی بڑی تھی؟ یعنی اس حوالے سے بہت عجیب وغریب چیزیں بیان کی گئی ہیں، اس سے پھر داستانیں بنتی ہیں اور یہودی جو

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

اس نے کہا کہ عنقریب میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچالے گا (نوح علیہ السلام نے) کہا کہ آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں مگر جس پر وہ رحم کرے اور ان کے درمیان موج حائل ہوگئی، پس وہ غرق ہونے والوں میں سے ہوگیا (43)

باتیں گھڑنے کے بڑے ماہر تھے، وہ اور زیادہ عجب داستان بنا کر پیش کرتے تھے، بہر حال مختلف لوگوں نے اس سلسلہ میں بہت ساری چیزیں بیان کی ہیں لیکن اللہ رب العالمین نے جو کچھ واضح فرمادیا ہے ہمارا ایمان اسی پر ہونا چاہیے اور اسی سے فائدہ اٹھا کر ہم اپنی بات کو صحیح طریقے سے پیش کر سکتے ہیں۔ اسرائیلی روایات کے بارے میں ہمارا رویہ یہی ہونا چاہیے کہ یہ صحیح بھی ہوسکتی ہیں اور نہیں بھی ہوسکتیں۔ اصل علم اللہ رب العالمین کے پاس ہے۔

آیت 43 قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ: نوح علیہ السلام نے جب بیٹے کو دعوت دی اور دلائل کے ساتھ قائل کرنے کی کوشش کی تو وہ کہنے لگا کہ یہ پہاڑ بہت بلند ہیں، کیا یہ سیلاب پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی اوپر نکل جائے گا۔سیلاب مزید بڑھا تو میں پہاڑ کے اوپر اور زیادہ بلندی پر چڑھ جاؤں گا اور یہ پہاڑ مجھے بچالے گا۔ دنیادار شخص کی نظر ہمیشہ وسائل پر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایمان والا شخص سمجھتا ہے کہ یہ کوئی معمول کی چیز نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا ایسا عذاب ہے جس کا مقصد سب دشمنوں کو سزا دینا ہے۔ کوئی کافر اس عذاب سے بچ نہیں سکے گا لیکن جس کے علم میں یہ چیز نہ ہو وہ تو یہی سوچے گا کہ پہاڑ بہت زیادہ بلند ہے، یہاں سیلاب کیسے پہنچ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آج کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ دس، گیارہ ہزار فٹ بلند پہاڑ ہے، اب اس کے اوپر سے کوئی پانی نکلنے کی بات کرے تو کوئی اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ بندہ سوچتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ سیلاب کتنا اوپر جاسکتا ہے، کچھ حد تک یہ پہاڑ کے کسی حصے کو ڈھانپ لے گا، اس سے زیادہ اوپر تو نہیں جائے گا۔ نوح علیہ السلام کے بیٹے نے بھی یہی سوچ کر کشتی میں بیٹھنے سے انکار کیا۔

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ: نوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کا عذاب ہے۔ تم پہاڑ پر چڑھنے جیسی تدبیریں کر کے اس عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ اللہ کی تدبیر کے مقابلے میں دنیاوی وسائل کامیاب نہیں ہوسکتے۔ فرمایا: ﴿ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴾ [آل عمران: ۵۴] جب ایک طرف انسانوں کی تدبیریں ہوں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ تدبیر کر رہا ہو تو کوئی شخص اس ذات باری تعالیٰ کی تدبیر کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مسلمان جنگوں میں

وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ

اور کہا گیا اے زمین! اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان! تھم جا اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام تمام کر دیا گیا اور

محض وسائل پر نہیں، اللہ پر توکل کرتے ہوئے میدانوں میں بڑی بڑی دشمن قوتوں سے ٹکراتے ہیں۔ عام لوگ اسلحہ اور وسائل کی بنیاد پر دشمن سے ٹکرانے کا سوچتے ہیں لیکن مجاہد کہتا ہے کہ میں اللہ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے جتنی تیاری کر سکتا ہوں اتنی کروں گا باقی میرا معاملہ رب تعالیٰ کے سپرد ہے۔ مجھے جتنی کامیابی ملے گی اللہ کی مدد سے ملے گی اور اگر میرا بچاؤ ہوگا تو وہ بھی خالقِ کائنات کی مدد ہی سے ہوگا۔ میرا سارا معاملہ تو میرے رب کے ساتھ ہے۔

وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ: ''اور ان کے درمیان موج حائل ہوگئی، پس وہ غرق ہونے والوں میں سے ہوگیا۔'' نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے درمیان ابھی بات ہو رہی تھی کہ ایک طوفانی لہر آئی اور ان کے بیٹے کو لقمہ بنا کر لے گئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا۔ یہ اللہ رب العالمین کا عدل اور انصاف ہے۔ وہ دکھانا چاہتا ہے کہ نبی کا بیٹا بھی اگر مشرک، ظالم، نافرمان اور باغی ہے تو اس کے لیے بھی فیصلہ وہی ہے جو دوسروں کے لیے ہے۔

آیت 44 وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ . . . . : پچھلی آیات میں قومِ نوح پر عذاب کا ذکر ہوا تو اب عذاب رکنے کی بات ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے حوالے سے ایک ایک چیز کو نکھار کر بیان کیا ہے۔ جب عذاب آیا تو نیچے سے زمین پانی اگل رہی تھی اور آسمانوں سے بھی شدید بارش کی صورت میں پانی برس رہا تھا، یوں یہ پانی پہاڑوں کی بلندیوں سے بھی اوپر نکل گیا۔ یعنی اس عذاب کا آنا بھی معمول سے ہٹ کر تھا اور اس کے رکنے کا انداز بھی بالکل مختلف تھا کہ جس سے پتا چلے کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے زمین کو حکم دیا کہ اس پانی کو واپس نگل لے اور دوسری طرف آسمان کو حکم دیا کہ اب مزید پانی نہیں برسانا۔

وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ: ''اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام تمام کر دیا گیا۔'' سطحِ زمین پر جتنا پانی تھا وہ ختم ہوگیا تاکہ اللہ کے جن بندوں کو کشتی کے ذریعے بچا لیا گیا ہے وہ آرام سے اپنے گھر بنائیں۔ گویا ایسا نہیں تھا کہ زمین اس قابل نہ رہی ہو کہ اس میں آبادی نہیں ہو سکتی تھی۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ جس علاقے میں عذاب آ جائے وہاں آبادکاری بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ آپ حج یا عمرہ کے لیے سعودی عرب جائیں اور مدینہ منورہ سے تبوک کی طرف سفر کریں تو راستے میں وہ پہاڑیاں آتی ہیں جنھیں مدائن صالح (صالح علیہ السلام کی بستیاں) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ پہاڑ ہیں جہاں اللہ کا عذاب آیا تھا، یہاں لوگوں نے پہاڑوں کو کھود کر گھر بنا رکھے تھے۔ اگرچہ اس وقت بھی کچھ گھروں کے نشانات موجود ہیں لیکن ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی ان پہاڑوں کی حالت اور کیفیت ایسی ہے کہ لگتا ہے جیسے

ربع

وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

وہ (کشتی) جودی (پہاڑ) پر ٹھہر گئی اور کہہ دیا گیا کہ ظالم لوگوں کے لیے دوری ہے ﴿44﴾

ابھی ان پر اللہ کا عذاب آیا ہو۔ ان پہاڑوں میں آج بھی اتنی وحشت اور دہشت کی کیفیت دکھائی دیتی ہے کہ اس منظر کو دیکھنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بہرحال قومِ نوح کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اللہ رب العالمین فرماتے ہیں کہ ہم نے انھیں آباد کرنے کے لیے پانی خشک کر کے ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ جنھیں تباہ کرنا تھا وہ تباہ ہو گئے اور جنھیں واپس لا کر آباد کرنا تھا انھیں وہاں لا کر آباد کر دیا۔

وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ : جب طوفان رکا تو نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر آ کر ٹھہر گئی۔ بائبل میں اس کا نام ''آرک'' یا ''ارارات'' (Ararat) بیان ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بات لکھی ہے کہ اس دور کے عراق میں پہاڑوں کا وسیع سلسلہ تھا جہاں یہ پہاڑ موجود تھا لیکن موجودہ دور میں کوہِ ارارات (Ararat) ترکی، ایران اور آرمینیا کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ جودی پہاڑ جہاں نوح علیہ السلام کی کشتی آ کر ٹھہری اسے ''جبل الحارث'' اور فارسی میں ''کوہِ نوح'' بھی کہتے ہیں۔ کشتی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَ جَعَلْنٰهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [العنکبوت : ۱۵] ''اور ہم نے اسے تمام جہانوں کے لیے بڑی نشانی بنا دیا۔'' اور فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ تَّرَكْنٰهَاۤ اٰيَةً ﴾ [القمر : ۱۵] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس کو ایک نشانی بنا چھوڑا۔'' قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی عبرت کے لیے کشتی کو ثابت و سالم رکھا، یہاں تک کہ اس امت کے اول لوگوں نے بھی اسے دیکھ لیا۔ [تفسیر ابن أبي حاتم : ٦/ ٢٠٣٧، ح : ١٠٩١٦] کچھ عرصہ قبل مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعے یہ رپورٹس بھی منظر عام پر آئی ہیں کہ سیاحوں نے اس علاقہ سے ایک بڑی کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختے بھی دریافت کیے ہیں، تاہم اس کے متعلق قطعی طور پر یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ واقعتاً یہ تختے نوح علیہ السلام کی کشتی کے ہی ہیں۔

وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ : ''اور کہہ دیا گیا کہ ظالم لوگوں کے لیے دوری ہے۔'' ''بُعْدًا'' کا لغوی معنی دور ہونا، ہلاک ہونا ہے اور اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہونا ہے، یعنی ظالم لوگ دنیا و آخرت میں اللہ کی رحمت سے دھتکار دیے گئے۔ قرآن مجید میں ظلم کا وبال کئی طرح سے بیان ہوا ہے، مثلاً سورۃ الشوریٰ (۲۱، ۴۰) میں ہے کہ بے شک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اسی طرح سورۃ القصص (۵۰) اور المائدہ (۷۲) میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا، ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔ ان آیات میں جو بھی بیان ہوا ہے وہ سارا مفہوم ہی ''بُعْدًا'' کے لفظ میں داخل ہے، البتہ یہاں ہلاکت اور عذاب مراد ہے۔ اس عذاب کا آنا رب تعالیٰ کی طرف سے شدید غصے کا اظہار تھا۔ جو لوگ اللہ کی نافرمانیوں و بغاوتوں میں حد سے بڑھ

وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ

الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ

اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے رب کو پکارا، پس کہا اے میرے رب! بیشک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ﴿45﴾ فرمایا اے نوح! بے شک وہ تمھارے اہل سے نہیں، بے شک اس کے عمل

جانے والے ہوں وہ خالقِ کائنات کے عذاب کا شکار ہو کر رہتے ہیں۔ یہ واقعات امتِ محمد ﷺ کے لیے بہت بڑی دعوت ہیں کہ تم نے قومِ نوح کا وہ راستہ اور شرک و تکبر کا انداز اختیار نہیں کرنا جو ان میں موجود تھا۔ یہ چیزیں اللہ کے عذاب کا سبب ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔

آیت 45 وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ . . . : نوح علیہ السلام نے جب اپنے بیٹے کی سفارش کی تو کہا کہ اے اللہ! یہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے۔ تو نے کہا تھا کہ اپنے اہل کو کشتی پر سوار کر لو تو تیرے کہنے کے مطابق میں سفارش کرتا ہوں۔ اے اللہ! تیرا وعدہ سچا ہے۔ تو نے کہا تھا کہ میں تیرے اہل کو بچاؤں گا، لہٰذا میرے بیٹے کو اس عذاب سے بچا لے۔ تیرا فیصلہ سب سے بڑا ہے اور کسی کا فیصلہ تیرے مقابلے میں نہیں ہے۔ نوح علیہ السلام اللہ رب العالمین سے التجا کر رہے ہیں کہ تو نے کہا تھا اپنے اہل کو اپنے ساتھ کشتی میں بٹھا لو تو یہ چونکہ میرا اہل ہے اس لیے میں اس کی سفارش کر رہا ہوں۔

آیت 46 قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ . . . : نوح علیہ السلام کی التجا پر اللہ تعالیٰ نے صاف کہہ دیا کہ تیرا بیٹا تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ مفسرین نے اس کے دو معنی بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ اس کا عقیدہ ٹھیک نہیں اور اس کا عمل عملِ صالح نہیں ہے۔ اس نے اسلام قبول نہیں کیا اور وہ دین میں تمھارے صالح ساتھ نہیں ہے۔ دوسرا معنی اس کا یہ کیا گیا ہے کہ "اِنَّهٗ" میں "ہٗ" کی ضمیر نوح علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے بیٹے کی طرف نہیں۔ اگر بیٹے کی طرف ہو تو اس کا مطلب ہو گا کہ اس کا عمل درست نہیں ہے لیکن اگر یہ ضمیر نوح علیہ السلام کی طرف ہو تو اس کا مطلب ہو گا کہ آپ کا سفارش کرنا درست نہیں ہے۔ یہ دونوں باتیں امام طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہیں۔ [دیکھیے تفسیر الطبري: ۱۲/ ۴۲۹، ۴۳۴] اس آیت میں صاف واضح کر دیا گیا ہے کہ اگرچہ یہ آپ کا بیٹا ہے لیکن اس کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ ہر مشرک پر اس کے عذاب کا کوڑا ضرور برسے گا۔ اس اصول پر آپ کا بیٹا بھی اسی عذاب کا شکار ہو گا۔ بچانے کا وعدہ اس اہل کے بارے میں کیا گیا ہے جو آپ کے ساتھ اسلام میں شامل ہیں۔

اللہ رب العالمین نے نوح علیہ السلام کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے یہ بات واضح کی ہے کہ تیرے اہل کے بھی دو حصے ہیں: ایک حصہ وہ ہے جو دین میں تمھارے ساتھ ہے، یہ اللہ کی پکڑ کا شکار نہیں ہو گا جبکہ دوسرا حصہ وہ ہے جو دین میں تیرے ساتھ نہیں ہے، اس کے لیے رب تعالیٰ کا فیصلہ عذاب کا ہے۔ یہاں ایک اہم بات سمجھ لیں کہ نبی معصوم ہوتے ہیں۔

مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾

صالح نہیں تھے، پس تم مجھ سے اس کا سوال نہ کرو جس کے بارے میں تمھیں علم نہیں، بے شک میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تمھیں نادان لوگوں میں سے نہیں ہونا چاہیے ﴿46﴾

معصوم کا معنی یہ نہیں ہے کہ نبی سے بھول چوک نہیں ہوسکتی۔ یہ صرف اللہ رب العالمین کا خاصہ ہے جسے ''سبحان'' کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف سے کسی بھول کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔معصوم کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کو غلطی سے محفوظ رکھتا ہے اور اگر کسی قسم کی کوئی خطا ہو جائے تو اسے معاف کر کے فوراً اس کا ازالہ کر دیتا ہے۔ نبی کے حوالے سے کوئی بات امت کے پاس ایسی نہیں ہوتی جو اللہ کی طرف سے نہ ہو۔ ہمارے ہاں بعض لوگ اولیاء اور مجذوب قسم کے لوگوں کو بھی معصوم سمجھتے ہیں کہ ان سے غلطی نہیں ہوسکتی۔آپ ان سے کہیں کہ فلاں مجذوب تو گالیاں دیتا ہے تو وہ کہیں گے کہ تجھے کیا پتا وہ اپنی زبان میں کیا کہہ رہا ہے؟ تجھے گالیاں نظر آتی ہیں اندر سے یہ اپنے رب کا ذکر کر رہا ہے۔ جب شرک پر مبنی عقیدے بنا لیے جائیں تو پھر اس قسم کے احساسات پیدا ہوتے ہیں۔

نوح علیہ السلام کی بات ہو رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی معصومیت کو مجروح نہیں ہونے دیا بلکہ دل میں بیٹے سے متعلق خیال پیدا ہونے پر اس کی سفارش کی تو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کی غلط فہمی دور کر دی اور انھیں معاف فرما کر اپنے نبی کی معصومیت کو قائم رکھا۔ دوسری طرف اگر '' اِنَّهٗ '' میں '' ہٗ '' کی ضمیر بیٹے کی طرف سمجھی جائے تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نبی کی قربت رکھنے والا شخص بھی اللہ کے عذاب کا شکار ہوسکتا ہے۔ بیٹے سے زیادہ کوئی قریبی نہیں ہوتا، یہ تو باپ کا حصہ ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت نے یہ ساری چیزیں بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ جو کوئی اس کے حکم کے مطابق نہیں چلتا وہ فرماں بردار نہیں ہے، اس کی سفارش نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اسے اپنی پکڑ سے محفوظ رکھے گا۔ نوح علیہ السلام کا بیٹا اور ان کی بیوی رب تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئے۔ جو لوگ اسلام میں آئے وہ بچ گئے اور جو کفر میں رہے سب برباد ہو گئے، چاہے وہ نبی کے اہل میں سے ہی کیوں نہ تھے۔

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ : نوح علیہ السلام اس بات کا علم نہیں رکھتے تھے کہ ان کے بیٹے کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔نبی کے پاس بھی علمِ غیب نہیں ہوتا۔ یہ علم صرف اللہ رب العالمین کے پاس ہے کہ کون کیا کرے گا اور اس کے متعلق کیا فیصلہ ہو گا؟ مفسرین بیان کرتے ہیں نوح علیہ السلام کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جب تمھیں اس بات کا علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو تمھاری سفارش پسند آئے گی یا نہیں اور وہ اس سے ناراض ہو گا یا خوش ہو گا تو پھر تم نے ایسی بات کیوں کی ہے۔اس سلسلہ میں نبی ہوتے ہوئے تمھیں بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔

اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ : ''بے شک میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تمھیں نادان لوگوں میں سے

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۴۷﴾

اس نے کہااے میرے رب! بے شک میں تیری پناہ چاہتاہوں کہ میں تجھ سے وہ سوال کروں جس کے بارے میں مجھے علم نہیں اور اگر تو نے مجھے معاف نہ کیااور مجھ پر رحم نہ کیا تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا (47)

نہیں ہونا چاہیے۔'' مطلب یہ کہ اب توتمھیں معاف فرما دیا لیکن آئندہ ایسی غلطی نہیں کرنی۔ یہ نبیوں کا طریقہ نہیں ہے۔ نبی تو بہت فرماں بردار ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ معمولی سا سہو ہوا ہے لیکن رب تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی فوراً اصلاح فرمائی ہے۔ اللہ تمام انسانوں کا رب ہے۔ وہ نبیوں سے بھی سوال کرسکتا ہے اور ان کی طرف سے ہونے والی بھول چوک کو بھی واضح کر دیتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بدر کے قیدیوں سے فدیہ لے کر انھیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو سورۂ انفال (۶۸) میں ہے کہ اللہ نے فرمایا: ﴿ لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ فِيۡمَاۤ اَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴾ ''اگر اللہ کی طرف سے لکھی ہوئی طے شدہ بات نہ ہوتی تو تم نے جو (مال) قبول کیا تھااس کی وجہ سے تمھیں بڑا عذاب پکڑ لیتا۔'' ایسے ہی سورۂ توبہ (۴۳) میں ہے: ﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنۡكَ‌ ۚ لِمَ اَذِنۡتَ لَهُمۡ ﴾ اے نبی! ہم نے آپ کو معاف فرما دیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ آپ نے عذر بہانے بنانے والے منافقین کو جہاد پر نہ جانے کی رخصت کیوں دی۔ یعنی پہلے محبت و شفقت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے نبی کو معاف کرنے کی بات کی اور پھر اس کے ساتھ ہی اصلاح بھی کر دی۔

یہ غزوۂ تبوک کی بات ہو رہی ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو پیچھے رہنے کی اجازت دے دی تو اللہ تعالیٰ کو یہ اجازت دینا پسند نہیں آیا۔ اس آیت سے یہ بات بھی سمجھ آتی ہے کہ نبی انسانوں میں سے سب سے اعلیٰ درجے کے لوگ ہیں لیکن اللہ رب العالمین کے سامنے وہ اس کے بندے ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کی اصلاح فرماتا ہے۔ اس طرح کے قابلِ اصلاح واقعات سے انبیاء علیہم السلام کی شان میں کمی نہیں ہوتی بلکہ ان کے رجوع الی اللہ سے وہ تائبین کا مقام پالیتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ [الفتح: ۲] ''تاکہ اللہ آپ کی اگلی اور پچھلی لغزشیں معاف کر دے۔''

آیت 47 ﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ . . . ﴾: نوح علیہ السلام کو فوراً اپنی لغزش کا احساس ہو گیا اور وہ معافی مانگنے لگے۔ کہنے لگے کہ اے اللہ! اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا تو میرے بچاؤ کی کوئی شکل نہیں ہے اور میرے لیے آخرت کا خسارہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ بندے کا توحید کا عقیدہ بہت پختہ ہونا چاہیے۔ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک دعوت کا کام کیا اور توحید کی عظمت کی بات کی، لیکن غلطی کی گنجائش ان کے پاس بھی نہیں ہے۔ وہ بھی اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ
ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾

فرمادیا گیااے نوح! ہماری جانب سے سلامتی اور ان برکتوں کے ساتھ اتر جاؤ جو تم پر اور تمھارے ساتھ بہت ساری جماعتوں پر ہیں اور بہت سی اُمتیں وہ ہوں گی جنھیں ہم عنقریب فائدہ تو پہنچائیں گے، پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا﴿48﴾

کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ! تو مجھے معاف فرمادے میں نے سفارش کر کے صحیح نہیں کیا۔ اس بات کا سارا علم صرف تیرے پاس ہے کہ تو نے کس کو عذاب دینا ہے اور کس کو محفوظ رکھنا ہے۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔

آیت 48 ﴿قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا﴾: نوح علیہ السلام کی کشتی جب جودی پہاڑ پر رک گئی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ اور آپ کے ساتھی اس کشتی سے سلامتی اور امن کے ساتھ نیچے اتر آئیں۔ رب تعالیٰ نے تمھیں محفوظ رکھا ہے جبکہ نافرمانوں میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔ مطلب یہ کہ تم اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس احساس کے ساتھ اترو کہ ساری حفاظت اللہ رب العالمین کی طرف سے ملی ہے۔ تمھیں دنیا میں اب جتنا وقت گزارنا ہے ایمان کی حفاظت اور سلامتی کے ساتھ گزارنا ہے، اس کے عوض اللہ تعالیٰ تمھیں دنیا میں امن و سلامتی عطا فرمائے گا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جو معاشرے اللہ کی فرماں برداری سے محروم اور نافرمانیوں میں مبتلا ہوں انھیں دنیا میں امن و سلامتی نہیں ملا کرتی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ [الأنعام: ۸۲] ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان میں بڑے ظلم (شرک) کی آمیزش نہیں کی، یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت والے ہیں۔''

﴿وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ﴾: نوح علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی جو زندہ بچ گئے ہیں ان پر ہم آسمانوں سے برکتیں نازل کریں گے۔ ان کی نسل آگے چلے گی اور ان کے پھیلنے سے بہت وسیع و عریض دنیا آباد ہو گی۔ ابن کثیر اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس وقت دنیا میں آبادی اتنی ہی تھی، اسی لیے نوح علیہ السلام کو آدمِ ثانی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نسل کو پھیلایا اور یہ لوگ ایک قوم کی شکل اختیار کر گئے اور پھر ان کے مختلف قبیلے بن گئے۔ جب قومِ نوح پر عذاب آیا تو صرف وہ لوگ بچے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ اب اللہ رب العزت نے چونکہ انھی کے ساتھ دنیا کو آباد کرنا اور زمین پر پھیلانا تھا، اس لیے اس ذات باری نے اس چیز کا ذکر کیا ہے کہ آپ اور آپ

تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ ۚ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَلَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا ۛؕ فَاصۡبِرۡ ۛؕ اِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۹﴾ ع

معانقۃ ۹ الوقف علیٰ فاصبر احسن والیٰ

یہ غیب کی خبریں ہیں جن کو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ کو ان کا علم تھا اور نہ آپ کی قوم کو، لہٰذا صبر کیجیے! بے شک اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے (49)

کے ساتھیوں کے سب گروہوں پر اللہ تعالیٰ بہت زیادہ برکتیں نازل کرے گا اور ساری زمین کو برکتوں سے بھر دے گا۔ تمھاری صلبوں سے اللہ تعالیٰ اتنی اولاد پیدا کرے گا کہ وہ زمین پر قوموں کی صورت میں پھیلیں گے، یعنی نسلوں کا بڑھنا، آبادیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہونا اور وسائل کا ملنا، یہ سب چیزیں اللہ رب العالمین کی برکتوں میں سے ہیں۔
وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ: ''اور بہت سی اُمتیں وہ ہوں گی جنھیں ہم عنقریب فائدہ تو پہنچائیں گے، پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔'' مفسرین نے ''اُمَمٌ'' کا معنی گروہ، جماعتیں، لوگ اور نسلیں کیا ہے۔ فرمایا، ان سب کو ہم ایک مدت تک فائدہ دیں گے، یعنی ہم انھیں مہلت دیں گے اور مواقع عطا کریں گے لیکن جو کوئی اللہ کی نافرمانی کرے گا تو اے نوح! جس طرح تمھاری قوم پر عذاب آیا ان ظالموں پر بھی اللہ کا عذاب آئے گا۔ ''عَذَابٌ اَلِيۡمٌ'' سے مراد دنیا اور آخرت دونوں کا عذاب ہوسکتا ہے۔ دنیا میں بھی بعض قوموں پر بڑا دردناک عذاب آتا رہا ہے، جیسے قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ صالح اور قومِ لوط پر عذاب نازل ہوئے، یا پھر اس سے مراد دوزخ کا عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماں برداروں کے لیے آسمانوں سے رحمتوں و برکتوں کے دروازے کھولے گا۔ کافروں کو بھی دنیا میں وسائل اور دوسری چیزیں ملیں گی لیکن دنیا میں انھیں دی گئی مہلت ختم ہوجائے گی اور پھر ان کے لیے عذاب ہی ہوں گے۔

آیت 49 تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ . . . : اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد ﷺ سے کہہ رہے ہیں کہ نوح علیہ السلام کا بیٹا اور بیوی اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے۔ یہ غیب کی خبروں میں سے ایک ہے۔ اس وحی کے نازل ہونے سے پہلے آپ اور آپ کی قوم کے لوگ اس بارے میں نہیں جانتے تھے۔ عربوں میں اگرچہ بہت سارے قصے مشہور تھے، جیسا کہ ہمارے ہاں بھی کتابوں میں پرانے قصے اور کہانیاں لکھی ہوتی ہیں لیکن ان میں سے جو چیزیں بے بنیاد اور بے اصل ہیں، ان پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ قوموں پر عذاب کے جو قصے رب تعالیٰ نے بیان کیے ہیں وہ مکمل طور پر حق اور سچ ہیں۔ اللہ رب العزت نے درحقیقت یہ بات واضح کی ہے کہ نبی ﷺ بھی عالم الغیب نہیں ہیں اور نبی کے پاس بھی وہی علم ہوتا ہے جو انھیں وحی کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس آیت کا معنی یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے غیب کی ساری خبریں اپنے نبی پر منتقل کر دیں، اس لیے وہ عالم الغیب ہوگئے ہیں، وہ ہر چیز کو جان لیتے ہیں اور انھیں غیب کی ساری خبروں کا

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ

اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود (علیہ السلام) کو بھیجا، انھوں نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبات کرو، اس کے علاوہ تمھارا

علم ہے تو یہ معنی کسی صورت صحیح نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیج کر نبی کو کسی بھی چیز سے آگاہ کرسکتا ہے۔ جب نبی نے امت کو بتادیا تو اس کے بعد دوسروں پر بھی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ خالق ارض وسماء نے یہاں یہ اصول بیان کیا ہے کہ اے نبی! ہم نے آپ کے سامنے جو قصہ بیان کیا ہے وہ غیب کی خبروں میں سے ایک ہے۔ ہمارے بیان کرنے کے علاوہ تمھارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جس سے تم اس کی حقیقت کو سمجھ سکو۔ اس کے بارے میں نہ آپ جانتے ہیں اور نہ آپ کی قوم جانتی ہے لیکن جب آپ کو وحی کے ذریعے بتادیا جائے تو پھر آپ کی قوم میں سے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ آپ کی طرف سے بیان کی گئی کسی بات کا انکار کرے۔ آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ آپ اپنے رب کی طرف سے دیے گئے اس علم کو دنیا میں عام کریں۔

فَاصْبِرْ: ''لہٰذا صبر کیجیے!'' نوح علیہ السلام کے واقعہ میں صبر کی بہت زیادہ اہمیت واضح ہوتی ہے۔ ساڑھے نو سو سال تک نوح علیہ السلام نے دعوت دی اور مسلسل اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ ان کے ہاں بت پرستی، اوہام پرستی اور شرک کے دوسرے مظاہر عام تھے۔ اس شرک کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ نے قومِ نوح پر عذاب نازل کیا۔ جو شرک نوح علیہ السلام کی قوم کرتی تھی اسی میں مکہ والے مبتلا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العالمین نے اہلِ مکہ اور دوسرے قبائل کو یہ بات سمجھائی ہے کہ تم نے اس شرک سے ہر صورت بچ کر رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم دیا ہے کہ آپ نے صبر کرنا ہے۔ نوح علیہ السلام نے صبر سے کام لیتے ہوئے سینکڑوں سال تک دعوت کا کام جاری رکھا تو آپ نے بھی دینِ حق کی دعوت پیش کرنے سے پیچھے نہیں رہنا اور اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرتے رہنا ہے۔

اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ: اللہ رب العالمین کا یہ پختہ اصول ہے کہ وہ اچھے نتیجے اور کامیابیاں متقین کو عطا کرتا ہے۔ فرماں برداری کرنے والوں کے لیے کامیابیاں صرف دنیا تک ہی محدود نہیں ہوتیں، آخرت میں بھی انھیں اجرعظیم سے نوازا جاتا ہے۔ اصل کامیابی آخرت ہی کی ہے اور متقین ہمیشہ اچھے انجام کو پہنچتے ہیں۔ دنیا میں نیک لوگوں پر بھی بڑی تکلیفیں اور آزمائشیں آتی ہیں، لہٰذا یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ اللہ کی پکڑ سے دوچار ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزمائشوں میں مبتلا کر کے ان کے گناہ معاف کرتا اور ان کے درجات بلند کرتا ہے۔ موت سے پہلے پہلے ان کے گناہوں کی صفائی ہو جاتی ہے اور وہ بہترین انجام کو پہنچتے ہیں۔ اللہ کے مخلص بندوں کو ہمیشہ اپنی آخرت ہی کی سب سے زیادہ فکر رہتی ہے۔